۸ جنوری ۱۹۷۲ء

رجسٹرڈ نمبر L.922
فون نمبر ـــ 29

ایڈیٹر
آل احمد سرور

فی کاپی بیس پیسے
قیمت سالانہ ۱۰ روپے
اشاعت کی تاریخیں

ہفتہ وار ہماری زبان

جلد ۳۱ | انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) | شمارہ ۲

اداریہ

یہ یا وہ کے بجائے یہ بھی اور وہ بھی

ہمارے ملک میں عام ذہن اس قدر سادہ ہے کہ وہ ہر چیز کو سفید یا سیاہ، اچھی یا بری، دوست یا دشمن، سر پر بٹھانے کے قابل یا گردن زدنی سمجھتا ہے۔ عام اردو دوست کے نزدیک ہندی والے اردو کو پنپنے نہیں دیتے، ہندی والا یہ نہیں سمجھ سکتا کہ تامل یا بنگالی یا اردو والے ہندی کے مقابلے میں اپنی زبان کو کیوں ترجیح دیتے ہیں۔ عام ہندو ذہن مسلمان کو کچھ شبہے کی نظر سے دیکھتا ہے، عام مسلمان سمجھتا ہے کہ ساری دنیا اس کی سب سے قیمتی متاع یعنی اسلام کو اس سے چھیننے کی برابر کوشش کر رہی ہے۔ انگریزی کے چاہنے والے ہندوستانی زبانوں کی ترقی کو ملک کی وحدت اور تہذیب کی بلندی کے لئے خطرہ تصور کرتے ہیں، صرف ایک ہندوستانی زبان جاننے والا یہ سمجھتا ہے کہ انگریزی جب تک ملک سے ہٹائی نہ جائے گی ہماری زبانیں ترقی نہ کر سکیں گی۔ ان سب مثالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہمارے ذہنوں پر یہ یا وہ کی حکومت ہے، ہم نے ابھی تک یہ بھی اور وہ بھی کی بلاغت اور افادیت کو نہیں سمجھا ہے۔ سمجھ لیں تو ہمارے سارے دلدر دور ہو جائیں۔

زبان کے معاملے میں عام ہندوستانی کا رویہ یہ ہے کہ وہ اپنی زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان صرف اقتصادی مجبوری کی بنا پر سیکھتا ہے، قومی یک جہتی، ملک کی ضروریات، علم کے تقاضے، اسے چنداں متاثر نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین تعلیم اور سیاست داں جتنے فارمولے بناتے ہیں ان کی روح پر عمل نہیں ہوتا، ان کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنے مطلب کا کر لیا جاتا ہے۔ اگر ہمارے یہاں دو یا تین زبانیں خوشی سے سیکھنے کا چلن عام ہو جائے تو ملک میں نہ صرف یک جہتی بڑھ جائے گی بلکہ عام ذہنی معیار بھی بلند ہو جائے۔ ہم یہ بات چند مثالوں سے واضح کرنا چاہتے ہیں۔

اترپردیش میں بڑی اکثریت کی زبان ہندی ہے، مگر ایک قابل لحاظ اور اہم اقلیت کی زبان اردو ہے۔ اکثریت کی زبان اقلیت کو سیکھنا لازمی ہے کیونکہ یہ ریاست کی سرکاری زبان ہے۔ اترپردیش میں جن طلبہ کی مادری زبان اردو ہے وہ سب ہندی پڑھتے ہیں اور انھیں پڑھنی چاہیے مگر اس طرح نہیں کہ انھیں اردو نہ آئے اور ہندی آجائے۔ حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ بنیاد صحیح قائم کرے یعنی اردو اقلیت کے طلبہ کو ابتدائی اور ثانوی تعلیم اردو کے ذریعہ سے دے۔ ہاں اس پر اصرار کرے کہ انھیں تیسرے درجے سے ہندی سکھائی جائے اور ہندی میں ان کی استعداد ہندی کے ذریعہ پڑھنے والے سے زیادہ یا کم نہ ہو۔ اس طرح اردو کے ذریعہ پڑھنے والے طالب علم کو اپنی ثانوی تعلیم ختم کرتے وقت اچھی اردو اور اچھی ہندی آتی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ثانوی تعلیم کی منزل پر وہ ایک اور زبان انگریزی بھی پڑھے گا جس کا معیار نہ تو مادری زبان کا ہوگا نہ سرکاری زبان کا مگر اتنا ہوگا کہ وہ انگریزی کی ابتدائی کتابیں یا انگریزی اخبار پڑھ سکے اور معمولی خط و کتابت انگریزی میں کر سکے۔ ہندی کی ساری ریاستوں میں اردو کے طالب علم کے لئے ہندی اور پھر انگریزی سے واقفیت مشکل نہیں ہے اسی طرح ہندی کے طالب علم کے لئے کسی ایک جدید ہندوستانی زبان سے واقفیت مشکل نہیں ہونی چاہیے۔ سنسکرت پر اس منزل پر اصرار غلط ہے۔ سنسکرت کو اختیاری مضامین میں رکھنا چاہیے۔

اگر کچھ لوگوں کی سنسکرت پڑھانی ضروری ہے تو ہندی کے نصاب میں ہائی اسکول میں سنسکرت کے لئے کچھ نمبر مخصوص کیے جا سکتے ہیں، مگر ہندی کے طالب علم کو کسی جدید ہندوستانی زبان کے سیکھنے میں پس وپیش نہ ہونا چاہیے۔ یہ جدید ہندوستانی زبان اردو بھی ہو سکتی ہے، بنگالی بھی پنجابی بھی اور تامل بھی۔

غیر ہندی ریاستوں میں اردو کے طلبہ کے لئے بظاہر مشکل ہے، مگر غور سے دیکھا جائے تو انھیں اردو کے بعد اپنی علاقائی زبان کو اہمیت دینی چاہیے۔ اس کے بعد انگریزی کہ جب تک ہندی کے ساتھ انگریزی بھی پورے ملک کی سرکاری زبان ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں کہ ہندی کے علاوہ غیر ہندی ریاستوں کے اردو اقلیت والے طلبہ علاقائی زبان یعنی انگریزی سیکھیں، مگر اپنی ریاست کی سرکاری زبان کا پڑھنا ان کے لئے بہر حال لازمی ہونا چاہیے۔ آندھرا میں اردو والوں کو تیلگو اور اس کے بعد انگریزی سیکھنی چاہیے۔ اسی طرح میسور میں کنڑ اور پھر انگریزی مدراس میں تامل اور پھر انگریزی، مہاراشٹر میں مراٹھی اور پھر انگریزی بنگال میں بنگالی اور پھر انگریزی وغیرہ۔ اکثریت کو اگر موقع ملے گا تو اس کی خاصی تعداد جدید ہندوستانی زبان کے زمرے میں اردو بھی سیکھے گی، اردو دوستوں کو اپنے علاقے سے اپنا رشتہ استوار رکھنا چاہیے۔ ہندی والوں کو جدید ہندوستانی زبانوں میں سے کوئی ایک زبان ضرور سیکھنا چاہیے اور اردو سیکھنے میں انھیں آسانی ہے۔ یہ ہو جائے تو زبانیں الگ نہیں کریں گی، لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لائیں گی۔

مشہور ناول نگار عادل رشید کا انتقال

نئی دہلی ادبی حلقوں میں اس خبر سے بڑا ملال ہوگا کہ ہندوستان کے مشہور ناول نگار اور تقریباً ڈیڑھ سو ناولوں کے مصنف عادل رشید کا ۱۳ر جنوری کو دل کے دورہ میں مبتلا ہو کر انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر غالباً ۵۲، ۵۳ سال کی ہوگی۔ پسماندگان میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں نیز ایک بیوہ مذری عادل رشید ہیں جو ہند پاک کے

مشہور مزاح نگار شوکت تھانوی کی بھانجی ہیں۔

• الجمعیۃ دہلی

صفحہ ۱ سے آگے

پاکستان کے اختلافات ختم ہو جائیں اور دونوں ملک اچھے پڑوسیوں کی طرح رہ سکیں، مگر پاکستان کے حکمران ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ان کی بیٹی اندرا گاندھی جو آج ہندوستان کی وزیر اعظم ہیں دل سے چاہتی ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان امن و آشتی کے سائے میں زندگی گزاریں۔ ہندوستان کو یہ جنگ مجبوراً لڑنی پڑی اور جمہوری اور سیکولر ہندوستان توسیع پسند ہرگز نہیں ہے۔ خواہ اس کے دشمن کچھ ہی کیوں نہ کہیں اُسے کسی کی زمین کے ایک انچ کا لالچ نہیں۔ اسلام امن و صلح کا مذہب ہے جہاد کا حکم اسی وقت ہے جب مذہب کو خطرہ ہو۔ مجھے بڑا رنج ہوتا تھا جب میں دیکھتا تھا کہ مغربی پاکستان کے فوجی حکمراں اسلام کا نام لے رہے ہیں اور بنگال کے مسلمانوں کو ہندوؤں اور توپوں کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ مغربی پاکستان کے باشندوں کو اب تک اسلام کے نام پر بہت بہکایا گیا ہے۔ اگر وہ سچی مذہبیت کو اپنائیں، جدید دور کے تقاضوں کو سمجھیں، اپنی ساری تاریخ کو نظر میں رکھیں، ازمنۂ وسطیٰ کے ذہن اور جاگیردارانہ دور کے تصورات سے نکلیں، جمہوری اداروں کو فروغ دیں اور اپنے عوام کی ترقی اور خوشحالی پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دیں تو ان کے سامنے ایک شاندار مستقبل ہے۔ ہندوستان ان کا دوست بننا چاہتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے کے دوست ہو جائیں تو پھر بڑی طاقتیں برصغیر کو فٹ بال کا میدان نہ بنا سکیں گی۔ پاکستان والوں کو میں اقبال کا یہ شعر یاد دلانا چاہتا ہوں ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

(آل انڈیا ریڈیو کے شکریہ کے ساتھ)

اعلان

ہماری زبان اور اردو ادب کی قیمتوں میں اضافہ

ہماری زبان اور اردو ادب کے معزز خریداروں کی خدمت میں اطلاعاً عرض ہے کہ کاغذ اور پریس کی شرحوں میں اضافہ کی وجہ سے یکم جنوری ۱۹۷۲ء سے دونوں کی قیمت میں حسب تفصیل ذیل اضافہ کیا گیا ہے۔

۱۔ ہماری زبان۔ سالانہ قیمت ۶ روپے
فی پرچہ ۲۰ پیسے

۲۔ اردو ادب۔ سالانہ قیمت پندرہ روپیہ
فی کاپی چار روپے

انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ)

عبدالمغنی

قدروں کا اعتبار

"قدر" کا لفظ جمع کے عدد میں قریب نصف صدی سے جس معنے میں استعمال ہو رہا ہے وہ اس کا اصل معنی نہیں ہے بلکہ انگریزی سے مستعار ہے اور براہ راست انگریزی لفظ Values, Value کا ترجمہ ہے عربی میں قدر کا معنی اندازہ ہے اور اسی سے مشتق ہے تقدیر، جس کا مفہوم یہ ہے کہ خالق کائنات نے کائنات میں پائی جانے والی تمام اشیا کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے اور اسی کے مطابق زندگی کا پورا کارخانہ چل رہا ہے۔ اردو محاورے میں قدر، عزت اور قیمت کے مفہوم میں بلکہ ان دونوں لفظوں کے ساتھ الگ الگ مترادف ہو کر بولا جاتا ہے، مثلاً کہتے ہیں: قدر و عزت یا قدر و منزلت اور قدر و قیمت۔ بہرحال جب سنہ ۱۹۳۶ء کے بعد اردو ادب میں انگریزی سے متاثر تنقیدوں کی گرم بازاری ہوئی اور انگریزی تنقید کی ایک کثیر الاستعمال اصطلاح "ویلوز" کا اردو میں ترجمہ کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی تو نظر انتخاب لفظ "قدر" پر پڑی اور اس کی جمع "اقدار" کا استعمال کثرت سے ہونے لگا۔ بعد میں اقدار کو ہندوستانی انداز کی جمع "قدروں" یا "قدریں" کی شکل میں بھی استعمال کیا جانے لگا اب سوال یہ ہے کہ ویلوز یا اقدار کا مفہوم ادب میں ہے کیا؟

میرا خیال ہے کہ بالعموم اس سلسلے میں ابہام اور انتشار پایا جاتا ہے۔ مختلف لکھنے والے اس کو مختلف انداز میں استعمال کرتے ہیں اور بہت سے لوگ تو بے دریغ استعمال کرتے ہیں، جن میں کم ہی ایسے ہیں جو اس لفظ کو سمجھ بوجھ کر بھی استعمال کرتے ہوں، بلکہ صورت یہ ہے کہ ایک رائج الوقت اور چلتا ہوا سکہ سمجھ کر بہتیرے لکھنے والے اپنے جملوں میں اس لفظ کو اسی طرح کھپانے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح بہتیرے شعرا کسی اچھے قافیے کو اپنے اشعار میں باندھنے کی فکر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "قدروں" کی تعریف اور اس لفظ کے مطالب کا تعین ذرا دشوار ہے۔ بہرحال میں نے اپنے مطالعے کی بنیاد پر اس کا جو مفہوم سمجھا ہے وہ یہ ہے۔ ہر سماج میں صدیوں کی تہذیبی و تمدنی ترقیات اور عام تجربات و واقعات کے نتیجے میں کچھ روایات ایسی بن جاتی ہیں اور ان کی بنیاد پر کچھ تصورات و تخیلات ایسے ابھر جاتے ہیں جن کی حیثیت مسلم الثبوت اور متفق علیہ ہو جاتی ہے، ہر شخص نہ صرف ان کی اہمیت و افادیت کا قائل ہوتا ہے بلکہ اس کے جذبات و احساسات ان کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں اور پھر یہ روایات و تصورات ایک معروف چیز بن کر ہر قسم کی گفتگو اور نقد و بحث میں حوالے اور استناد کے طور پر استعمال ہونے لگتے ہیں، ان ہی مستند تصورات کا نام اقدار ہے۔ اگر میں اقدار کی تعریف ایک فقرے میں کرنا چاہوں تو کہوں گا: قابل قدر بنیادی تصورات۔

قدروں کی اس تعریف و تشریح سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا کیا اعتبار سماج اور اس کے تمام اداروں بشمول ادب میں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قدروں کی حیثیت بالعموم زندگی کے ہر شعبے اور بالخصوص ادب میں ایک معیار اور معیار کی ہے، تہذیب زندگی کی ہر ادا ان ہی قدروں کے حوالے سے معتبر ہے اور ادب کی ہر اعلیٰ تخلیق سے قدروں ہی کی کرن پھوٹتی ہے اس لئے کہ یہ تخلیق قدروں ہی کا نور جذب کر کے بروئے اظہار آتی ہے۔ اگر کوئی تخلیق اقدار حیات سے بالکل خالی ہو تو وہ محض ایک کاریگری ہے، زندہ و توانا ادب نہیں ہے۔ دراصل تہذیبی قدریں ادب کے لئے محض زیور اور آرائش و زیبائش کا سامان نہیں ہیں، بلکہ ادب کی رگوں میں وہ اس سرخ خون کی طرح دوڑتی ہیں جس کے بغیر چہرے پر نہ تو حیات کی تازگی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ حسن و جمال کی تابانی نظر آ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ حسن و جمال کی بنیادی شرط تناسب، اعتدال بھی قدروں ہی کے طفیل بروئے کار آتی ہے، ادب کے اجزائے ترکیبی میں عضویاتی ترتیب و توازن کسی نظام اقدار سے استفادہ کے بغیر ممکن نہیں۔

مشہور فرانسیسی ادیب اور فلسفی ژاں پال سارتر نے قدروں کے اعتبار پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

"ایک غیر جسمانی دنیا ادیب کا احاطہ کئے ہوئے ہے جہاں انسانی احساسات فوری و شخصی تاثر کی کیفیت سے بلند ہو کر مثالی احساسات کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں یعنی ایک لفظ میں "اقدار" بن چکے ہیں۔" (ادب کیا ہے؟ صفحہ ۱۸) اپنے اس بیان کی تشریح کرتے ہوئے سارتر نے لکھا ہے کہ ادیب اقدار کے سہارے ایک ایسی خیالی دنیا تخلیق کر لیتا ہے جو بالکل حقیقی دنیا کے مشابہ ہوتی ہے، یہاں تک کہ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ فطرت فن ہی کی نقالی کرتی ہے، جس طرح افلاطون کے نزدیک حیات کی دنیا قدیم انسانی امثال (آرکیٹائپس) کی نقل کرتی ہے۔ سارتر نے یہ باتیں "تحریر کیا ہے؟" کے موضوع پر لکھتے ہوئے نقادوں کی تنقید میں تحریر کی ہیں اور محولہ بالا اقتباس میں ادیب سے مراد نقاد ہی ہے۔ اس طرح سارتر نے دراصل قدروں کو ایک جامد، فرسودہ اور تخیلی چیز قرار دیا ہے۔ ممکن ہے موصوف کا یہ موقف ان کے مشہور عالم فلسفے "وجودیت" کا ایک شاخسانہ ہو لیکن وجودیت ہی کی طرح قدروں کے متعلق ان کا یہ بیان بھی انشا پردازی اور فلسفہ طرازی کی ایک ترنگ سے زیادہ کوئی وزن نہیں رکھتا۔ سارتر کی فکر میں عام طور پر انتشار اور تضاد پایا جاتا ہے۔ چنانچہ موصوف کے مذکورہ بیان کا مقابلہ "تحریر کیوں؟" کے موضوع پر خود کتاب ہی میں اور دیئے ہوئے اقتباس سے صرف آٹھ صفحے بعد کے اس بیان سے کر کے دیکھا جائے۔ "مصنف اور قاری کی باہمی کوشش ہے جو منظر عام پر اس مخصوص اور تخیلی چیز کو لاتی ہے جسے دماغ کی تخلیق کہتے ہیں۔ لہٰذا کوئی فن ایسا نہیں ہے جو دوسروں کے لئے اور دوسروں کے ذریعہ تخلیق نہ کیا گیا ہو۔" یہ اختتام ہے ایک ایسے پیراگراف کا جس کا ابتدائی جملہ ہے "یہ اس طرح یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک شخص صرف اپنے لئے لکھتا ہے۔"

اسی سلسلۂ بیان میں دو صفحے بعد سارتر تمام ادبی تخلیقات کو ایک اپیل،

قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے: چوں کہ تخلیق کی تکمیل اس کے پڑھے جانے ہی میں ہو سکتی ہے اور فن کار کے لئے ضروری ہے کہ اپنے شروع کئے ہوئے کام کی انجام دہی کا فرض دوسرے کے حوالے کرے، اور یہ قاری کے شعور کے ذریعے ہی ممکن ہے کہ وہ (فن کار) اپنے آپ کو اپنی تخلیق کے لئے جزو لازم تصور کرے، لہٰذا تمام ادب ایک اپیل ہے۔ لکھنے کا مطلب ہی پڑھنے والے سے یہ اپیل کرنا ہے کہ وہ اس انکشاف کو معروضی وجود میں تبدیل کر دے جو میں نے الفاظ کے ذریعے کیا ہے۔" ممکن ہے سارتر کے یہ خیالات اس کی اشتراکیت پسندی ہوں، مگر یہ بہر حال وجودیت کی اس ترنگ سے ٹکراتے ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سارتر کے یہ خیالات موصوف سے زیادہ بڑے ادیب و شاعر ٹی، ایس، ایلیٹ اور اس کے رفیق ازرا پاؤنڈ کے علی الترتیب "روایت" اور "ثقافت" کے ان ذہنی تصورات کی یاد دلاتے ہیں جنھوں نے ایک ایسے دور میں قدروں کے اعتبار کو مستحکم کر دیا ہے جب ہر طرف بے قدری اور بے اعتباری کے طوفان اٹھتے نظر آتے ہیں۔ ایلیٹ کا بہت مشہور بیان ہے کہ ہم جب کوئی کام کرتے ہیں تو ہمارے آباد اجداد کا خون ہماری رگوں میں دوڑ رہا ہوتا ہے، یعنی افلاطونی تصور کی وہ قدر انسانی "اشکال" (آرکی ٹائپس) جنھیں سارتر نے اپنے پہلے بیان میں فرسودہ کہہ کر رد کر دیا تھا ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ایلیٹ نے اپنے تاریخی مقالے "روایت اور انفرادی صلاحیت" میں واضح کر دیا ہے کہ کوئی بھی انفرادیت روایت سے الگ ہو کر بروئے اظہار نہیں آسکتی اور نہ دنیائے ادب میں اس کا کوئی اعتبار ہو سکتا ہے۔ روایت سے بغاوت ممکن نہیں اور ہر ادبی ارتقا روایت کی توسیع کر کے ہوتا ہے، نہ کہ اس کی تردید و تخریب کر کے۔

یوں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز کا ایک پس منظر بہر حال ہوتا ہے اور وقت کا کوئی بھی لمحہ اور اس لمحے کا کوئی بھی فعل تاریخ کے اندر ہی واضح ہوتا ہے۔ بہ قول اقبال ؂

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں۔ زندگی اور ادب کی قدریں ہمیں یہی پس منظر (پرسپکٹیو) اور تاریخ عطا کرتی ہیں جن کا اعتبار کر کے ہی ہم اپنے ہر عمل کا اعتبار قائم کر سکتے ہیں۔

برہم ناتھ دت

بڑھے چلو

۱۔ اے رہروانِ منزلِ عرفاں بڑھے چلو
ذوقِ طلب میں دست و گریباں بڑھے چلو
ہم دوشِ عزم و ہمتِ مرداں بڑھے چلو
ہم پائے رخشِ عمرِ گریزاں بڑھے چلو
کوشش سے تا بسرحدِ امکاں بڑھے چلو

۲۔ چھوڑو خیالِ راحت و عزلت کا یک قلم!
ہر گام پر ثبات سے ہو آشنا قدم!
چھالوں سے جذبۂ رفتار ہو نہ کم!
دشتِ طلب نہیں ہے کم از وادیٔ حرم!
اس سرزمیں میں ناصیہ سایاں بڑھے چلو

۳۔ سستی نہ راہ میں ہو تمہارے گلے کا ہار
ہونے نہ پائے "جبر" عناں گیرِ اختیار
غفلت نہ غالب آئے خبردار! ہوشیار!
خوابیدہ پا پڑے نہ رہو صورتِ کنار
مانندِ آبِ بحرِ خروشاں بڑھے چلو

۴۔ ڈالے نہ تم کو وہم کسی اشتباہ میں
تو ہر ایک شے کو خرد کی نگاہ میں
الفت سے راہ سال کی کٹتی ہے راہ میں
رہ جاؤ بغض و کیں سے الجھ کر نہ راہ میں
اس خار سے سمیٹ کے داماں بڑھے چلو

۵۔ مقصود اشتراک نہیں اعتقاد کا
کافی ہے برگ و ساز ہم اتحاد کا
حاجت ہے رابطے کی نہ اندیشہ زاد کا
کافی ہے توشہ باہمی ربط و وداد کا
ہے سامنے عروج کا میداں بڑھے چلو

۶۔ یوں دل میں شوقِ دشت نوردی ہو دم بدم
بڑھتا ہے جیسے فطرت آہو میں ذوقِ رم
نامہ کی التجا ہے کہ جب تک ہے دم میں دم
جادہ پہ رک سکے نہ کسی حال میں قدم
افتاں بڑھے چلو کبھی خیزاں بڑھے چلو

ہماری زبان

سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

(مدیر)

نورالحسن۔ نورؔ

اعتصام الدولہ مرزا کلب حسین خاں نادرؔ کا دیوان پنجمین

"تذکرۂ نادرؔ" مصنفہ اعتصام الدولہ مرزا کلب حسین خاں بہادر مبارز جنگ نادرؔ، مرتبہ جناب محترم سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ اتفاقاً میری نظر سے گزرا اور میں نے مرتب موصوف کا فاضلانہ اور تحقیقی مقدمہ جو اس میں شامل ہے پڑھا۔ اس میں انھوں نے جناب نادرؔ کی جملہ تصانیف کا ذکر کیا ہے مگر ایک اہم تصنیف کا ذکر اس مقدمہ میں نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصنیف فاضل مقدمہ نگار کی نظر سے نہیں گزری اور وہ ہے جناب نادرؔ کا دیوان پنجمین۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ موسوم بہ شکرستانِ نادر میرے پاس موجود ہے۔ تاریخ طباعت اور نام و مقام مطبع حسب ذیل عبارت سے جو کتاب کے آخر میں ہے ظاہر ہوتی ہے۔ (عبارت کے شروع کے دو لفظ کرم خوردہ ہیں)۔۔۔۔

دیوانِ خیص عنوان ہٰذا از ۱۲۸۸ھ شروع گردیدہ امروز واقعہ ۱۲ جنوری ۱۸۷۲ء مطابق ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۸۸ھ در مطبع منشی رام ...... موسوم مطبع دلکشا واقع محلہ کمپ خشک ..... محلہ تلیا لیس باہتمام کارگزاران مطبع موصوف باختتام رسید۔

یہ دیوان صرف غزلیات کا ہے جس میں ۳۹۶ غزلیں ہیں تعداد صفحات ۴۸۸۔ سرورق کے علاوہ ۴۰۰ صفحات تک غزلیں۔ آخر صفحہ پر تصحیح اغلاط اور بقیہ ۴۰۱ تا ۴۸۸۔ تقاریظ و قطعات تاریخ طبع وغیرہ۔ تمام غزلوں کے ساتھ بحر اور وزن مفصل درج ہے۔

غزلیں کافی طویل ہیں اور پورے دیوان میں صرف گیارہ اشعار کی غزلیں بمشکل دو چار ہوں گی۔ نو یا سات شعر کا تو کوئی وجود ہی نہیں تعداد غزلیات ردیف وار حسب ذیل ہے:-

الف ۸۲۔ ب ۳۔ پ ۲۔ ت ۴۔ ٹ ۲۔ ث ۳۔ ج ۲۔ چ ۳۔ ح ۲۔ خ ۴۔ د ۴۔ ڈ ۲۔ ذ ۲۔ ر ۸۔ ڑ ۲۔ ز ۲۔ س ۲۔ ش ۲۔ ص ۲۔ ض ۲۔ ط ۲۔ ظ ۲۔ ع ۲۔ غ ۲۔ ف ۳۔ ق ۲۔ ک ۲۔ گ ۲۔ ل ۴۔ م ۳۔ ن ۵۱۔ و ۲۲۔ ہ ۸۵۔ ی ۱۰۷۔

ایک چیز اور اس نسخے میں نظر آئی یعنی بہت سی غزلوں کے حاشیے پر کسی کسی شعر کے سامنے حرف "ج" چھپا ہوا ہے۔ پہلے تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ ہے کیا مگر نسخے کے آخر میں جو تقریظیں شامل ہیں ان میں سے دو میں ایک ایک فقرہ ایسا ملا جس سے کچھ واضح ہوا یعنی جن اشعار میں شاعر نے مضمون میں کوئی جدت پیدا کی ہے ان کے سامنے حرف "ج" لکھا ہوا ہے۔ وہ دو فقرے بعینہٖ نقل کئے دیتا ہوں ناظرین کرام خود رائے قائم کرلیں۔ (۱) از تقریظ جناب منیر شکوہ آبادی "اگر دُنِ جیم جدت تماشائے تجدید مضامین و تازگی تشبیہات بلندی گرا دچوں انگشت اشارت سبکتاں را راہ نما"

(۲) از تقریظ جناب نواب عبدالعزیز خاں) "جیم کا حرف جدت کے لئے نشانی ہوا ہے" اس دیوان میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر غزل کا مطلع یا تو نعت نبیؐ یا منقبت آل نبیؐ میں ہے۔ مقطع میں بھی اکثر و بیشتر کسی نہ کسی نہج سے ذکر یا اشارہ نبیؐ یا آل نبیؐ کا پایا جاتا ہے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جناب نادرؔ کو اپنے کچھ مخالفین سے بہت تکلیف پہونچی ہے کیونکہ کافی تعداد میں ایسے مقطعے ملیں گے جن میں انھوں نے دشمنوں یا حاسدوں کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

میرے پیش نظر اس دیوان پنجمین کا جو نسخہ ہے اس کا سرورق جس پر کتاب کا نام وغیرہ درج ہوتا ہے غائب ہے۔ شروع میں کوئی دیباچہ نہیں ہے اس کا پتہ یوں چلتا ہے کہ پہلی غزل کے شروع کے ۱۰ شعر نہیں ہیں جو یقیناً سرورق کے دوسرے صفحہ پر رہے ہوں گے۔ بہر حال آخر کے مضامین تقریظ وغیرہ سے نام دیوان اور دیگر ضروری تفصیلات معلوم ہو جاتی ہیں۔ کلام پر کوئی تبصرہ تو بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں مگر بات نکل آئی ہے تو کچھ عبارات تقاریظ اور قطعات تاریخ کے متعلق سن لیجئے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ ان کے اقتباسات بھی ملاحظہ فرمائیے جن سے جناب نادرؔ کی تصنیفات اور دواوین پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے مشاہیر شعرا اور معتقد صاحبانِ علم و ادب نیز رؤسا و عمائدین میں جناب نادرؔ کا مقام کیا تھا۔ ان اقتباسات میں آپ کو اس زمانے کی طرز نگارش کے اچھے نمونے ملیں گے جن سے آپ لطف اندوز ہوں گے۔ چنانچہ پہلی تقریظ ڈھائی صفحات کی نواب سید محمد علی خاں صاحب رئیس محشر آبادی کی ہے جس کے آخر میں موصوف کا ایک قطعہ تاریخ بھی ہے۔ اپنی تقریظ میں جن القاب و آداب کے ساتھ جناب نادرؔ کا نام صاحب دیوان ہٰذا کی حیثیت سے انھوں نے لیا ہے اور ذکر ترتیب و طباعت دیوان کیا ہے وہ ان کی حسب ذیل عبارت سے ظاہر ہوگا:-

"جو بارغ اشعار آبدار کر جناب حشمت مآب سالمۃ الامرا زبدۃ الشعرا فخر خاقانی و فردوسی رشک انوری و سعدی برادر صاحب والامناقب عالی مناصب اعتصام الدولہ سحبان زماں نواب ڈپٹی مرزا کلب حسین خاں بہادر مبارز جنگ متخلص بہ نادرؔ اوفق اللہ احضان آمال بجی محمد سید الانبیاء و آلہٖ نے زمین آسمان تمکین شعر میں آبیاری بحرِ مشہور جو دیوانِ فصاحت بیان ۱۲۸۶ھ میں مرتب کیا تھا اور وہ ۱۲۸۸ھ میں چھپا یا ترتیب کا نام شکرستان نادرؔ اور طبع کا نام دیوان محمود کہ دونوں نام تاریخی ہیں قرار دیا۔۔۔۔۔"

تقریظ کے آخری حصہ کا بھی اقتباس ملاحظہ ہو۔ اس سے جناب

نادر کی دیگر منظوم تصانیف پر روشنی پڑتی ہے۔

"۔۔۔۔۔ اور یہ بھی شاعران نامی و ذاکران گراں کو معلوم ہے کہ سوائے ایں مختصر مخمس نظم رنگین کے اور بھی ہزاران ہزار گوہر شاہوار بحیاں ذکر جلیل و خیا داہر جزیل جنبش بحر و خار طبع مصنف عالی وقار سے ساحل بیان پر پہونچے اور سلک نظم میں منسلک ہو کر جدا جدا نام سے بحلیہ طبع محلی و مروج ہوئے ہیں۔ بیاں تفصیل ایک دیوان اعجاز نشان تخمیناً چار سو غزلوں کا۔ دوسرا کارنامہ تقریباً چھ سو مخمسوں کا کہ اکثر غزلوں پر شاعران خوش مقال و ناظمان بلند خیال سابق بحال کے مصارع برجستہ لگائے ہیں۔ تیسرا گلدستہ مضامین تازہ زیب ایک سو قصائد مدحیہ حضرات میں صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین کا۔ چوتھا مجموعہ مرثیہ و رباعیات و خمسہ جات نوحہ و سلام مبنی بر مصائب جناب سید الشہدا علیہ السلام۔

۔۔۔۔۔۔"

دوسری تقریظ کا عنوان بعینہٖ درج کرتا ہوں جس سے صاحب تقریظ کا نام اور اس تقریظ کی عجیب و غریب خصوصیت کا اظہار ہوگا یعنی یہ تقریظ جو اکتالیس فقروں پر مشتمل ہے اس کے ہر فقرے سے تاریخ طبع نکلتی ہے اور اس سخت التزام کے باوجود عبارت بار بط اور دیوان و صاحب دیوان کے متعلق ضروری اور مفید معلومات سے پُر ہے اور لطف یہ کہ پوری عبارت مسجع بھی ہے۔

"تقریظ بفکر عالی نواب صاحب جلیل المناقب والا مراتب جناب نواب مولوی عبدالعزیز خاں بہادر عزیز تخلص رئیس بریلی فقرات مسجع میں کہ جس سے سال طبع کتاب پیدا ہوتا ہے۔" ۱۸۸۰ تقریظ نادرہ۔

اختتام الدوله مرزا کلب حسین خاں نادر کے دیوان پنجمین پر۔ تحریر قلم عبدالعزیز خاں کی۔ (۱۲۸۷)

اب اس تقریظ کی عبارت کا آخری حصہ ملاحظہ ہو جس سے مورخ اور مسجع فقرات کا اندازہ ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ جملہ منظومات نادر کا پتہ بھی چلے گا۔

"طبع معلی کی یہ دانی بھی لائق توصیف ہے + اب یہ
دیوان حساب سے مصنف کے پانچویں تصنیف ہے +
۱۲۸۷
ایک دیوان بوضع قدیم مطبوع ہو چکا + دو ہیں میں
۱۲۸۷
مجموعہ مرثیہ و سلام کا + تیسرے میں عجیب قصیدے ایمانی +
۱۲۸۷
دیوان چہارم خمسے کا یادگار + اب یہ غزل کا دیوان
۱۲۸۷
پانچواں ہوا ہے + اور طبع پا کر مطبوع شاعراں ہوا
۱۲۸۷
ہے + عزیز اب ہنگام طبع دیوان حق نیاز مندی
۱۲۸۷
ادا کرتا ہے + چند فقرے بدیع ہدیہ جناب والا کرتا
۱۲۸۷
ہے + دیکھئے عنوان کے فقروں سے بھی سال طبع عیاں ہے +
۱۲۸۷

متن کے جملوں سے حساب سال ہجری کا نمایاں ہے +"
۱۲۸۷

تیسری تقریظ بزبان فارسی جناب منیر شکوہ آبادی کی ہے جن کا نام نامی محتاج تعارف نہیں ہے۔ اس تقریظ کے چند آخری جملے بطور اقتباس پیش کرتا ہوں جن میں جناب نادر کی دیگر منظومات کا ذکر ہے:۔

"۔۔۔۔۔ دیوانے کہ بست سال پیش ازیں جلوۂ شیوع نمودہ ہنوز بیاض دیدۂ ہر شہر و دیار است بل حمائل گلوئے روزگار۔ دوم دیوان مورخ دسکی بہ نظم نادر مشتمل بر مراثی و سلام قوافل اشک عزا ارا باہر لیت نادوش کوثر و دار السلام۔ سوم دیوان قصائد و منقبت است کہ موسوم و مورخ است بریاض نادر یہ سفینہ ایست مشحون بجواہر عبقرہ۔ چہارم دیوان مخمسات مورخ و مخاطب بہ دیوان غریب انجمن ایست نادر بل طلسم عجیب کہ پیشینان را باپسیاں ہم بغل گردانیدہ و گلی از غم روزگار رفتہ ما را باما متاخرین یکجا نشانیدہ۔ و ایں دیوان پنجمین است کہ و ساز نقش ہر صفت بستہ و در شش جہت بر صدر یکتائے مربع نشستہ"۔

ان تین تقریظوں کے علاوہ ایک تقریظ بزبان اردو اور تین اور تقریظیں کہ ہر ایک کے ساتھ قطعہ تاریخ بھی ہے۔ بزبان فارسی اس وقت کے مقتدر صاحبان علم و ادب کی تحریر کردہ شامل ہیں اور ایک خاتمۃ الطبع جس کی حیثیت بھی تقریظ ہی کی ہے فارسی زبان میں کاتب مطبع نے تحریر کی ہے جس کے طرز انشا سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں کاتب مطبع کا بھی مبلغ علم ناقابل لحاظ نہیں ہوتا تھا۔

قطعات تاریخ طبع دیوان ہذا جن کا ذکر شروع ہی میں کر چکا ہوں اس وقت کے شعراء کرام کے کہے ہوئے کافی تعداد میں شامل دیوان ہیں جن میں چند مشاہیر کے نام یہ ہیں:۔ مولانا غلام امام شہید، مرزا حاتم علی مہر، مطلع ہر گوپال تفتہ اور قلق لکھنوی وغیرہم۔ ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ علاوہ اس کے کہ جناب نادر ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے اور خود ذاتی حیثیت سے ان کا شمار اس وقت کے مقتدر امرا میں تھا وہ علم و فن اور سخنوری میں بھی اپنے زمانے میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔

مراسلات

اردو تعلیم کے لئے یکساں مانگ ہونی چاہیے

ہماری زبان کے پرچہ مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۶۶ء کے اداریہ میں یہ پڑھ کر تعجب ہوا کہ ہمارے بزرگان بھی ابتدائی تعلیم اردو کے لئے کتنے بچوں کی ضرورت ہے اس پر اتفاق نہیں رکھتے۔ کبھی ۴۰-۱۰ بچوں کا ہونا کہتے ہیں کبھی ایک بچہ کا ہونا کہتے ہیں۔ اس پرچہ میں ایک کلاس میں پانچ دو پورے اسکول میں بیس بچوں کا ہونا کافی سمجھتے ہیں۔ جب تک اردو چاہنے والے ایک متفقہ مانگ پر قائم نہیں رہیں گے اس وقت تک اردو کا کیس کمزور ہوتا رہے گا یوں تو چالیس کیا ۱۰۰-۲۰۰ بچے ہوں تب بھی ماسٹران اردو نہیں پڑھاتے اور نہ حکام توجہ کرتے ہیں جو لوگ ۴۰-۱۰ کی بات کرتے ہیں وہ جی۔او اور دیگر احکامات گورنمنٹ کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ جتنے جی۔او۔ گورنمنٹ نے اجرا کئے ہیں ان سب میں یہ ہے کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہو۔

پہلے پہل G.O.NO.498/XV-3191-48 مورخہ ۲۹ جولائی ۱۹۵۳ء میں ۴۰-۱۰ کا ذکر آیا ہے اس کی منشا یہ ہے کہ اگر ۴۰ بچے پورے اسکول میں یا ۱۰ بچے ایک درجہ میں ہوں تو اردو تعلیم کے لئے ایک استاد مقرر کیا جائے عموماً ہر اسکول میں ۴۰ بچوں پر ایک استاد دیا جاتا ہے اور جب ایک درجہ میں ۱۰ بچے ہوں گے تو دیگر درجوں میں بھی لازمی طور سے اردو کے بچے ہوں گے لہٰذا اس صورت میں بھی ایک استاد اردو تعلیم کے لئے مقرر کیا جائے ۴۰-۱۰ کا یہی مطلب ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ ۴۰-۱۰ بچے ہوں گے تو اردو تعلیم ہوگی اور ۳۹ یا ۹ بچے ہوں گے تو اردو تعلیم نہ ہوگی کیونکہ اسی جی۔او میں یہ بھی درج ہے کہ "ذریعہ تعلیم و امتحان پرائمری درجات میں بچوں کی مادری زبان ہوگی اور اگر مادری زبان علاقائی زبان سے مختلف ہو تو علاقائی زبان درجہ ۳ سے پہلے نہ پڑھائی جاوے"

یہاں ۴۰-۱۰ کا کوئی ذکر نہیں ہے جب درجہ ۳ سے پہلے ہندی نہ پڑھائی جائے گی تو اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ ایک بچہ بھی اردو کا ہو اس کو صرف اردو تعلیم درجہ ایک اردو دی جائے گی اور ابتدائی تعلیم درجہ ایک سے درجہ پانچ تک ذریعہ مادری زبان ہوگی اور ہندی درجہ ۳ سے بطور زبان پڑھائی جائے گی۔

علاوہ بریں اس جی۔او میں یہ بھی درج ہے کہ علاقائی زبان سکنڈری اسٹیج تک صرف بطور مضمون پڑھائی جائے گی اور مادری زبان ہی درجہ ۸ تک ذریعہ تعلیم ہوگی جس کے لئے اردو والوں کی مانگ مدتوں سے ہے مگر کوئی ادھر توجہ نہیں کرتا اس کے الفاظ یوں ہیں "THE REGIONAL LANGUAGE WILL HOWEVER BE A COMPULSARY SUBJECT THROUGHOUT THE SECONDARY STAGE"

اور یہی بات کمشنر لسانی اقلیت ہند نے اپنی دوسری رپورٹ کے پیرا ۲۱ میں لکھی ہے کہ "FOR JUNIOR HIGH SCHOOL CLASSES I.E CLASSES VI-VII-VIII THE LINGUISTIC MINORITIES ARE FREE TO RECEIVE EDUCATION THROUGH THE MEDIUM OF THEIR MOTHER TONGUE AND THERE IS NO RULE MAKING HINDI COMPULSARY."

مزید براں ۴۰-۱۰ کے بابت یہاں سے کمشنر لسانی اقلیت کو لکھا گیا تھا کہ کیا ۴۰-۱۰ بچے ہوں گے تو اردو پڑھائی جائے گی اور ۳۹-۹ بچے ہوں گے تو اردو نہ پڑھائی جائے گی۔ یو۔پی گورنمنٹ سے استفسار کے بعد کمشنر لسانی اقلیت نے بذریعہ خط NO.16/7/63/1322 DATED 24.6.65 یہ لکھا کہ "AS REGARDS THE LIMIT OF 40 OR 10 BOYS IT IS SURELY NOT THE INTENTION OF THE G.O. THAT IF THERE ARE 40 OR 10 BOYS THEY WILL BE TAUGHT URDU AND IF THEIR NUMBER IS 39 OR 9 THEY WILL NOT BE TAUGHT URDU."

یہی بات مرکزی گورنمنٹ کے اعلان مورخہ ۱۹۵۸ء میں ہے جس کو صوبہ نے بھی مانا ہے اس میں درج ہے کہ ہر ایک بچہ کو اردو میں تعلیم دی جائے گی اگر اس کی مادری زبان اردو ہے "FACILITIES SHOULD BE PROVIDED FOR INSTRUCTION AND EXAMINATION IN THE MOTHER TONGUE AT THE PRIMARY STAGE TO ALL CHILDREN WHOSE MOTHER TONGUE IS DECLARED BY THE PARENT OR GUARDIAN TO BE URDU."

اس اعلان میں سکنڈری اسٹیج میں اردو تعلیم دینے کا بھی ذکر ہے اور اردو ٹریننگ کا بھی حکم ہے جو حسب ذیل ہے

"FACILITIES FOR INSTRUCTION IN URDU SHOULD ALSO BE PROVIDED IN THE SECONDARY STAGE OF EDUCATION."

"ARRANGEMENT SHOULD BE MADE FOR THE TRAINING OF TEACHERS AND FOR PROVIDING SUITABLE TEXT BOOK IN URDU."

۱۹۴۷ء کے پہلے ہر اسکول میں اگر ایک بچہ بھی ہوتا تھا وہ اردو پڑھتا تھا اور ہر جگہ اردو استاد تھے کیونکہ بلا ہندی اردو پاس کئے کوئی ٹیچر وکل یا ڈیزمیں رکھا ہی نہیں جاتا تھا اس کے لئے تعداد مینول میں ہے اور کوئی بھی تھا۔ پھر اردو والے تعداد کے چکر میں کیوں پڑیں۔ لہٰذا ہم لوگوں کا مطالبہ یہ ہونا چاہئے کہ ہر بچہ کو جس کی مادری زبان اردو ہے اردو کے ذریعہ ابتدائی تعلیم دی جائے تعداد کی قید ضروری نہیں۔ اور یہ فیصلہ ۱۹۴۹ء کا ہے جو ۱۹۵۲ء کے جی۔او۔ مندرجہ بالا میں درج ہوا۔ جب ہر جگہ اردو دال استاد تھے۔

یہ کوشش ہونی چاہئے کہ اردو ٹریننگ ہو اور افسر جامعہ مثلاً ڈپٹی انسپکٹر یا سپرنٹنڈنٹ تعلیم یا لیڈی سپرنٹنڈنٹ وغیرہ مقرر ہوں جو اردو بھی جانتے ہوں۔ اردو کا دروازہ آگے ملازمت کے امتحان کے لئے دسرکاری کاموں میں استعمال کے لئے کھولا جائے تاکہ اردو تعلیم کا شوق ہو۔ اس کے لئے بھی کوشش کرنی چاہئے۔ درجہ تک ہندی پڑھنے والوں کو بھی اردو تعلیم دی جائے تاکہ دفاتر وعدالتوں میں اردو کاغذات کے داخلہ میں آسانی ہو۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی کوشش جاری رکھنی چاہئے۔

ہندی کی ضرورت فی الحال عدالتوں و دفاتر میں کام کرنے کے لئے ہے وہ درجہ ۳ سے ہندی بطور مضمون پڑھنے سے پوری ہو جاتی ہے اور بقیہ مضامین اگر نیچے سے اونچی سطح تک مادری زبان میں ہوں تو اس سے علمی استعداد و دماغی نشو نما ہو جائے یہ بات کوٹھاری کمیشن و ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سابق وزیر تعلیم و دیگر ماہر تعلیم نے کہی بھی ہے۔ مگر ابھی ذی اختیار اصحاب کی توجہ نہیں ہے یہی افسوس کی بات ہے بہر حال محبان اردو کی مانگ متفقہ ہونی چاہئے کہ ہر بچہ اردو پڑھے تبھی کامیابی ہو سکتی ہے۔

بنارس۔ ‏• داتا رسول

ناظم خط و کتابت اردو کورس جامعہ ملیہ کے نام دو خط

(۱)

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ کے ادارے کے ذریعہ ہندی زبان سے اردو کی تعلیم کامیابی کے ساتھ دی جا رہی ہے۔ شاید آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ میں لکھنؤ کا مسلمان ہوتے ہوئے اردو کیوں نہیں جانتا۔ ہمارے ساتھ کے بہت سے طالب علم اور دوست اردو جاننا چاہتے ہیں۔

جہاں تک میرا سوال ہے بچپن سے ہی کچھ ایسے حالات رہے ہیں کہ اردو کی طرف کوئی خاص دھیان نہ دے سکا۔ اپنے مذہب کو جاننے کے لئے ہم کو اردو جاننا بہت ضروری ہے۔

اردو کی تعلیم کا آغاز میں آپ ہی کے ذریعہ سے کرنا چاہتا ہوں آپ کے ادارے کے ذریعہ اردو کی تعلیم ہندی سے حاصل کرنے میں جو رعایت آپ نے دوسروں کو دے رکھی ہے اس سے آگاہ فرمائیں۔

شکریہ آپ کا

عبدالعلیم، اترپردیش

(۲)

آپ کے روانہ کئے ہوئے اردو خط و کتابت کورس کے پانچ عدد فارم داخلہ ملے جن میں سے دو عدد فارم بھروا کر اور ڈاک خرچ وصول کر کے اپنے ہاتھوں سے منی آرڈر کر رہا ہوں۔ باقی فارم رائے گڑھ سے باہر لوگ لے گئے ہیں، وہ بھی چند روز میں انشاء اللہ وصول ہو جائیں گے۔ اب براہ کرم فوراً بواپسی ڈاک پندرہ بیس داخلہ فارم بھیج دیجئے۔ میں نے یہاں پر طالب علم تیار کئے ہیں، ایک ایک دو دو فارم بھروا کر بھیجتا رہوں گا۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اتنی آسانی کے ساتھ اردو جیسی پیاری زبان حاصل کرنے کے لئے توجہ دلا رہا ہوں۔ اللہ میری کوششیں کامیاب کرے۔

آپ کے اشتہار کے متعلق ایک مقامی اخبار کے دفتر میں گیا تھا۔ اس نے اشتہار دیکھ کر اس کے متعلق جو کچھ لکھ دیا ہے وہ چٹ آپ کو روانہ کر رہا ہوں جیسا مناسب ہو ویسا جواب عنایت کیجئے گا۔

فقط السلام علیکم ناچیز

رائے گڑھ ایم۔پی حامد صحرائی

آنند نرائن ملاّ اردو اکاڈمی کے قائم مقام صدر

لکھنؤ۔ حکومت اتر پردیش نے جو اردو اکاڈمی قائم کی ہے اس کے قائم مقام صدر پنڈت آنند نرائن ملا مقرر کیے گئے ہیں اور سکریٹری محکمہ اطلاعات کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب صباح الدین عمر ہیں۔

ریاستی وزیر برائے قومی یکجہتی محترمہ بیگم حامدہ حبیب اللہ اکاڈمی کی صدر ہوں گی۔

اکاڈمی ایک رجسٹرڈ ادارہ ہوگا اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے ۵ لاکھ ۱۰ ہزار روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

درج ذیل حضرات اس کے انتظامی امور کے نگراں ہوں گے۔

بیگم حامدہ حبیب اللہ ریاستی وزیر برائے قومی یکجہتی، ریاستی وزیر تعلیم کا نامزد کوئی شخص، مرکزی حکومت کے ثقافتی امور کے سکریٹری شری ٹی۔ پی۔ سنگھ، محکمہ مالیات کے سکریٹری شری بھرت نرائن، محکمہ تعلیم کے سکریٹری۔ شری آر۔ ایس چودھری، محکمہ اطلاعات کے ڈائرکٹر شری شرومتی شرما، ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیم (اردو)، شری خلیل الرب، شری آنند نرائن ملا۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ پروفیسر احتشام حسین۔ پروفیسر محکمہ مالیات کے ڈپٹی سکریٹری شری شری لال شکلا، محکمہ تعلیم کے جوائنٹ سکریٹری شری ایم۔ یو۔ احمد، لسانی اقلیتی افسر شری ایس۔ پی۔ شکلا اور لکھنؤ، الٰہ آباد، بنارس اور علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے چیرمین اور محکمہ قومی یکجہتی کے سکریٹری جناب ترسبھون پرشاد۔

کمیٹی کے سپرد منجملہ دیگر کاموں کے ادبی اور سائنسی تحقیقات کا جن کا ابھی اردو میں ترجمہ نہیں ہوا ترجمہ کروانا اردو میں حالات سے متعلق کتابیں تیار اور شائع کرنا۔ اردو کی غیر شائع شدہ کتابوں کو شائع کرنا۔ انعامات دینا، مصنفین کی امداد اور اردو کی اعلیٰ تعلیم کے لئے طلبہ کو سہولتیں فراہم کرنا جس میں مالی امداد بھی شامل ہے اور سیمینار و کانفرنسوں کا منعقد کرنا۔

• قومی آواز لکھنؤ

اردو کے ساتھ زیادتیوں کے انسداد کا وقت آپہونچا ہے

اردو اکاڈمی کے نامزد چیرمین آنند نرائن ملا نے اپنے سرکاری تقرری کے کاغذات پر اردو میں دستخط کرتے ہوئے کہا کہ اردو والوں کو ان کے لسانی حقوق دلانے کے لئے اپنی امکان بھر کوشش کروں گا۔ میں اپنی اس رائے پر بدستور قائم ہوں کہ اردو کے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافیوں کے انسداد کا وقت اب آپہونچا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں کہ آپ مستقبل قریب میں اردو کو اس کا حق دلانے کے لئے کیا اقدام اٹھائیں گے؟ ملا صاحب نے کہا کہ میں سر دست وہ تمام باتیں کروں گا جن کا میں اردو داں عوام سے وعدہ کرچکا ہوں۔ دریں اثنا بیگم حامدہ حبیب اللہ نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ چیرمین کی تقرری اور سکریٹری کا تقرر اس لئے کیا گیا تاکہ اکیڈمی میں شامل ہونے والے افراد کے متعلق کوئی یہ نہ کہہ سکے وہ کوئی سفارش یا دباؤ کی بنا پر لئے گئے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو کا مسئلہ ایک لسانی مسئلہ کی حیثیت سے طے کیا جائے گا۔

• سیاست کانپور

اردو کو علاقائی زبان کا درجہ دلانے کا وعدہ

نئی دہلی۔ سوشلسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری شری مادھو ڈانڈیکے نے ایک پریس کانفرنس میں اپنی پارٹی کا انتخابی مینی فیسٹو پیش کیا ہے جس میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی وعدہ کیا گیا ہے کہ جن علاقوں میں اردو بولی جاتی ہے وہاں اردو کو علاقائی زبان کا درجہ دیا جائے گا اور ہائر سکنڈری کے درجہ تک تعلیم مفت ہوگی۔

• الجمعیۃ دہلی

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا سالانہ اجتماع

حیدرآباد۔ جناب سری نواس لاہوٹی معتمد عمومی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے اپنے ایک بیان میں انجمن کی مقامی شاخوں سے اپیل کرتے ہوئے کہا ہے کہ انجمن کا سالانہ اجتماع اسی بار حیدرآباد میں ۱۲ اور ۱۳ فروری ۱۹۷۲ء کو منعقد ہو رہا ہے ۱۲ فروری کی صبح اردو اساتذہ کا مشاورتی جلسہ ہوگا

اس روز سہ پہر کو انجمن کی شاخوں کے عہدیداروں کا خصوصی جلسہ ہوگا جس میں تنظیمی مسائل پر غور کیا جائے گا۔ ۱۳ فروری کو تمام اجلاس منعقد ہوں گے توقع ہے کہ سالانہ اجلاس سے قبل انجمن کی شاخیں بھی مقامی طور پر ایسے اجتماعات طلب کرکے موجودہ مسائل سے متعلق رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کریں اور ایک نوٹ قبل از وقت صوبائی شاخ کو روانہ کردیں جس میں اختصار کے ساتھ بتلایا جائے کہ اردو تعلیم کی اشاعت اور ترقی میں اسے کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور وہ کس قسم کے تنظیمی مسائل سے دوچار ہیں۔ اجتماع میں اتنا وقت نہیں تھا کہ تمام شرکاء اپنی تقریروں میں ان مشکلات و مسائل کا پورے طور پر اظہار کرسکیں اس لئے یہ گذارش کی جارہی ہے تاکہ شاخوں کی روانہ کردہ تفصیلات کی روشنی میں قرارداد کیا مرتب کی جاسکیں اور تنظیمی ڈھانچے میں اصلاح ہوسکے۔

• نامہ نگار

ترقی پسند مصنفین سے قائدین کا خطاب

حیدرآباد: جناب بدرالدین طیب جی نے کہا ہے کہ موجودہ رائے عامہ کی صحیح تربیت کے لئے دانشوروں کو اہم رول ادا کرنا چاہئے تاکہ ایک مضبوط اور طاقتور جمہوری ملک ہندوستان پر اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی بہتر طور پر تکمیل کرسکے نئی آزاد جمہوریہ بنگلہ دیش کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنانا بھی ہمارے ملک کے فرائض اور ذمہ داریوں میں شامل ہوچکا ہے جناب بدرالدین طیب جی آج شام اردو ہال میں انجمن ترقی پسند مصنفین آندھرا پردیش کے جلسہ میں صدارتی تقریر کررہے تھے جو پاکستان کی جارحیت اور دانشوروں کے فرائض کا جائزہ لینے کے لئے منعقد ہوا۔ جناب بدرالدین طیب جی نے کہا کہ ملک کے دانشوران غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوششیں کریں جو مسلمانوں کے تعلق سے پھیلائی جاتی ہیں۔ سماجی اور تہذیبی روابط اور تعلقات کے عمرانی اور نفسیاتی حقائق اور پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

• نامہ نگار

گورکھپور میں تعزیتی جلسہ

مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کو "حلقۂ ناقدین" گورکھپور کی جانب سے جناب عتیق عالم خاں کی قیام گاہ پر ایک تعزیتی جلسہ خواجہ غلام السیدین کے انتقال پر ہوا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر سلام سندیلوی نے کی۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ خواجہ غلام السیدین ایک اعلیٰ شخصیت کے مالک تھے۔ خصوصاً ان کا شمار ملک کے اعلیٰ ماہرین تعلیم میں کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک اچھے ادیب اور فلسفی بھی تھے۔ اگرچہ وہ باقاعدہ سیاسی الشان نہیں تھے۔ تاہم وہ قوم پرور نظریات کے حامل تھے۔ ان کے انتقال سے محفل علم و ادب کی شمع بجھ گئی۔ ان کی وفات علم و ادب کے لئے ایک سانحۂ عظیم ہے۔ پھر ایک تعزیتی قرارداد پیش کی گئی جس میں مرحوم کی روح کے لئے دعائے مغفرت کی گئی۔ اور ان کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کیا گیا۔

مقبول حسین گورکھپور

محمود ہاشمی کے اعزاز میں ادبی نشست

ڈاکٹر ظفر اوگانوی صاحب کی قیام گاہ پر اقدار لٹریری فورم کی جانب سے جدید ادب کے مشہور ناقد محمود ہاشمی صاحب کے اعزاز میں ایک ادبی نشست ہوئی۔ محمود صاحب نے جدید اردو ادب کے مخصوص مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے، جدید ادب کے مفہوم کو واضح کیا۔ بہت سے ادیبوں اور دانشوروں نے بحث میں حصہ لیا

اس کے بعد ایک مخصوص شعری نشست ہوئی۔ جس میں ممتاز نامور شعراء نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔ • ایم۔ اے لعل

عادل آباد میں اردو میڈیم جونیر کالج کی منظوری

حیدرآباد: ریاستی حکومت نے عادل آباد میں اردو جونیر کالج کے قیام کی منظوری دے دی ہے مسٹر پی نرسا ریڈی صدر آندھرا پردیش کانگریس اور جناب سید مختشر شاہ نائب صدر نشین قانون ساز کونسل کی مشترکہ مساعی سے شہریان عادل آباد کے ایک دیرینہ مطالبہ کی تکمیل ہوگئی۔ جناب سید مختشر شاہ نے اپنے ایک بیان میں ان تمام طلبہ سے جو اردو جونیر کالج میں داخلے کے خواہاں ہیں خواہش کی ہے کہ وہ فوری طور پر کالج کے پرنسپل سے ربط پیدا کریں

محفل خواتین کا کامیاب مشاعرہ

حیدرآباد: محفل خواتین کے زیر اہتمام ۲۹ دسمبر گذشتہ بھارتی تعمیر میں خاتون شاعرات کا ایک مشاعرہ زیر صدارت سابق وزیر سیاحت شریمتی روڈا مستری منعقد ہوا۔

صدر مشاعرہ نے محفل خواتین کی تشکیل کو حیدرآباد میں شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والی خواتین کے لئے فال نیک سے تعبیر کیا۔ اس یادگار مشاعرے میں حیدرآباد کی ممتاز شاعرات نے اپنے دلنواز کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

• ناز حیدر

جدید علوم کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ گو تہذیب کی تشکیل میں مذہبی اثرات بھی کام کرتے ہیں مگر مذہب پر تہذیب کی بنیاد نہیں ہوتی۔ اس بات سے مذہب کی تحقیر مراد نہیں بلکہ ایک سماجی اور عمرانی حقیقت کا اظہار کرنا ہے۔ دوسری بات جو عالمی تاریخ ہمیں بتاتی ہے یہ ہے کہ قوموں کے ارتقا میں بہت سی غیر مذہبی چیزیں، مثلاً دیومالا، لوک گیت، کسی علاقے کی جغرافیائی خصوصیات، اس کی تاریخ کے نشیب و فراز بہت اہم ہوتے ہیں۔ تیسری بات جو ہمارے سامنے آتی ہے یہ ہے کہ مجموعی طور پر جدید دور کی تاریخ میں جمہوریت، سیکولرزم اور سائنسی نظر کی اہمیت زیادہ ہے۔ پاکستان کے بنانے والوں نے مذہب کے نام پر مسلمانوں کو مجتمع کرنا چاہا، مگر انہیں حکومت تو بہرحال جدید دور کے تقاضوں کے مطابق چلانی تھی، مغربی تعلیم دینی تھی، جمہوریت کے خواب دکھلانے تھے، سائنس اور صنعت و حرفت کی ترقی کی طرف توجہ کرنی تھی، چنانچہ ان کے یہاں یہ تضاد بہت جلد واضح ہو گیا۔ ترقی پذیر ملکوں میں اول اول جمہوریت کا تجربہ لازمی طور پر کامیاب نہیں ہوتا کیونکہ ذہن پختہ نہیں ہو پاتے اور اس نظام کی نعمتوں پر سب کی نظر رہتی ہے۔ اس کی ذمہ داریوں کا احساس کم ہوتا ہے۔ پاکستان میں جب شروع میں سیاسی پارٹیوں نے ہوشمندی اور تدبر کا ثبوت نہ دیا تو فوجی حکومت بن گئی اور فوج کو جب ایک دفعہ اقتدار مل جائے تو وہ آسانی سے اسے ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ چنانچہ پاکستان کی فوجی حکومت نے عوام کے ابھرتے ہوئے اضطراب کو، اسلام اور ہندوستان دشمنی کے ملے جلے نعرے سے دبالیا، مگر بنگلہ دیش میں صورت حال مختلف تھی۔ وہاں کے لوگوں میں سیاسی شعور زیادہ تھا اور ان پر مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے ستم یہ کیا کہ ان کی پیداوار اور قدرتی وسائل کا بالکل اس طرح استحصال کیا جس طرح ایک نوآبادیاتی حکومت کرتی ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات دراصل پاکستان کی سالمیت پر کسی طرح حملہ نہ تھے وہ صرف بنگال کی پاکستان کے وفاق کے اندر رہ کر ترقی چاہتے تھے مگر مغربی پاکستان کے حاکموں کو یہ بھی گوارا نہ تھا۔ جب پہلی بار سارے عوام کو ووٹ کا حق ملا تو عوامی لیگ کو ایسی شاندار کامیابی حاصل ہوئی جس کی نظیر جمہوریت کی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ فوجی حکمرانوں کے پاس ایک ہی ہتھیار ہوتا ہے اور وہ ہے طاقت کا استعمال۔ یہ کیسی سالمیت ہے جس کی خاطر لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ قوم وہ ہے جس کے ہر فرد میں ایک مشترک رشتے اور ایک مشترک مقدر کا احساس ہو۔ یہ احساس بندوقوں اور توپوں کے بل پر نہیں پیدا کیا جا سکتا۔

پاکستان کے کچھ دانشوروں نے جب پاکستان کی جڑوں کی تلاش کی تاکہ اس کی انفرادیت IDENTITY متعین کی جا سکے تو انھوں نے موہنجو داڑو اور ہڑپا کا تو ذکر کیا، مگر مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی برصغیر کی تاریخ کو نظرانداز کر دیا اور برصغیر کی تاریخ کا بھی مطالعہ اس طرح کیا کہ ان تمام عناصر کو نظرانداز کر دیا جو ہماری مشترک تہذیب کی خصوصیت ہیں۔ پروفیسر مجیب نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستان سے آنا کچھ ملا ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں سے خاصے مختلف ہیں، مگر پاکستان کے مورخوں نے ان حقائق سے قطعی چشم پوشی کر لی۔ صدر ایوب کے دور میں رائٹرس گلڈ نے ادیبوں کو حکومت کا آلۂ کار بنانے کی سعی کی اور اگرچہ کچھ نئے ادیبوں نے برصغیر کی پوری تاریخ کا احساس دلایا، مگر اسے غیر اسلامی اور غیر پاکستانی کہہ کر مطعون کرنے کی کوشش کی گئی۔ "آگ کا دریا" قرۃ العین نے پاکستان میں لکھی تھی اور اگرچہ وہاں کے کچھ ادیبوں نے ذاتی طور پر قرۃ العین کی حمایت کی، مگر کتاب پر وہاں کے سرکاری حلقوں میں خاصی لے دے ہوئی۔ ان کی پہلی ناول "میرے بھی صنم خانے" کے کچھ صفحات لاہور کے ایک ناشر نے اس لئے حذف کر دئے کہ ان میں مشترک تہذیب اور ہندوستان کی قومی تحریک کی پاسداری ملتی تھی۔ پاکستان میں چند افراد کو چھوڑ کر دانشوری آزاد نہیں رہی، حریت فکر پروان نہیں چڑھی، سائنسی اور علمی نظر پیدا نہیں ہوئی۔ اپنے بل پر کھڑے ہونے کے بجائے سیاسی گٹھ جوڑ کی بنا پر طاقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ سرکاری افسروں اور صنعت کاروں اور بڑے زمینداروں کو من مانی کرنے کا موقع ملا۔ بڑی طاقتوں سے فوجی معاہدوں کے ذریعہ فوجی طاقت بڑھانے پر زور رہا۔ عوام کی حالت کچھ زیادہ بہتر نہیں ہوئی۔ ہاں ایک نیا دولت مند طبقہ ضرور پیدا ہو گیا جس نے سطحی جدت پرستی اختیار کر لی۔ آج کوئی معروضی طور پر اگر کشمیر کی حالت کا موازنہ کشمیر کے اس علاقے سے کرے جو پاکستان کے قبضے میں ہے، تو اسے اندازہ ہوگا کہ یہاں عوام کی حالت کتنی بہتر ہے، تعلیم کی کتنی ترقی ہوئی ہے، پیداوار کس طرح بڑھی ہے اور صنعتی ترقی کی رفتار کیا ہے اور اس کے مقابلے میں وہ دوسرا حصہ کس قدر پس ماندہ ہے۔

آج جب بنگلہ دیش آزاد ہو گیا ہے تو اب پاکستان کا تضاد دور ہو گیا ہے، پاکستان اب ایک جغرافیائی وحدت بھی ہے۔ اور ایک تہذیبی وحدت بھی۔ یہاں کے باشندوں میں اسلام کے علاوہ اس علاقے کی تہذیبی خصوصیات کا رشتہ بھی رہے گا۔ اگر یہ ہندوستان سے جنگ کا خیال ترک کر دے اور اپنی ساری توجہ اپنے قدرتی وسائل کے سلیقے سے استعمال، جمہوریت کے فروغ اور سوشلزم کے راستے پر چلنے میں لگا دے تو اس کی ترقی کے لئے شاندار امکانات ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ ان مشترک باتوں کی قدر کرنی چاہئے۔ ہندوستان جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کے راستے پر گامزن ہے۔ جواہر لال نہرو آخر عمر تک اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ ہندوستان اور

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

آل احمد سرور

میرا صفحہ

پاکستان میری نظر میں

جون ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا۔ جولائی ۱۹۴۷ء میں میں نے پاکستان کے متعلق چند اشعار کہے تھے جو یہاں برمحل معلوم ہوتے ہیں۔

چھوٹے سے دیے لائے ہیں محفل میں مرے دوست
اور اُن میں بڑے شمس و قمر دیکھ رہے ہیں
پیرانِ کلیسا کا تبسم نہیں دیکھا
بنتے ہوئے اللہ کا گھر دیکھ رہے ہیں
ساقی کے اس آئینِ کرم کو نہیں سمجھے
یہ رند خدا جانے کدھر دیکھ رہے ہیں
خورشید کے جلوؤں کی کہاں تاب ہے ان کو
تاروں میں کوئی راہگزر دیکھ رہے ہیں
کیا پردۂ ظلمات ہے کیا رہبری خضر
ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

بہرحال گاندھی جی اور مولانا آزاد کی شدید مخالفت کے باوجود ملک کی بڑی پارٹیوں کی مرضی سے ملک تقسیم ہوگیا اور پاکستان وجود میں آگیا۔ جب چھوٹا بھائی کسی طرح بڑے بھائی کے ساتھ رہنے کو آمادہ نہ ہو اور باہمی مفاد کی ہر کوشش میں کوئی نہ کوئی چال دیکھنے لگے تو علیحدہ ہو جانا سمجھ میں آتا ہے۔ مگر پاکستان کی تعمیر میں ایک نہیں کئی خرابیاں مضمر تھیں، اول تو اس کی بنیاد دو قومی نظریے پر رکھی گئی تھی جس کی رو سے مسلمان ایک علیحدہ قوم تھے اور قوم کی بنیاد مذہب تھا، دوسرے پاکستان کا ایک حصہ دوسرے سے بارہ سو میل کے فاصلے پر تھا، تیسرے اس میں مثبت اقدار کم اور منفی اقدار زیادہ تھیں۔ مولانا آزاد نے اپنی کتاب (INDIA WINS FREEDOM) میں صاف کہا تھا کہ اسلام کی تاریخ میں ابتدائی دور کو چھوڑ کر کبھی اسلام سیاسی اتحاد پیدا کرنے والی طاقت نہیں رہا، مگر اسلام کا نام لینے والوں نے اسلام کی تاریخ پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ مولانا مودودی ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلم لیگ اور پاکستان کے مخالف تھے۔ انھوں نے اپنے کئی مضامین میں لیگ پر یہ اعتراض کیا تھا کہ اسلامی حکومت اس طریقۂ کار سے نہیں بن سکتی جو مسلم لیگ نے اختیار کیا تھا۔ مولانا مودودی کی یہ بات تو صحیح ثابت ہوئی مگر خود انھوں نے پاکستان بن جانے کے بعد وہاں اسلامی حکومت کے قیام کی ضرور کوشش کی اور یہ بھول گئے کہ انھیں کے نظریے کے مطابق ان خطوں میں ممکن نہ تھا۔ پاکستان کو مسلم لیگ کے لیڈروں نے، پرانی سول سروس نے اور کچھ نئے صنعت کاروں نے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ وہاں جمہوریت کو ابھرنے کا موقع ہی نہیں ملا اور فوجی آمریت نے بدانتظامی دور کرنے کے بجائے اپنا شکنجہ مضبوط کر لیا۔ اب عوام کو اپنے فریب میں مبتلا کرنے کے لئے سوا اس کے چارہ کیا تھا کہ ایک طرف اسلام کا نام لیا جائے اور دوسری طرف ہندوستان کو ایک ہوا بنا کر پیش کیا جائے۔

مگر پاکستان سے ایک اور بنیادی غلطی ہوئی۔ مشرقی بنگال جو آج بنگلہ دیش ہے مغربی پاکستان سے صرف جغرافیائی اعتبار سے علیحدہ نہ تھا تہذیبی اعتبار سے بھی مختلف تھا۔ اگر اس بنیادی نکتے کو سمجھ لیا جاتا کہ اگرچہ اسلام وسط ایشیا میں بھی ہے، مغربی ایشیا میں بھی اور جنوبی ایشیا میں بھی، مگر ان تینوں علاقوں کے مسلمانوں میں تہذیبی اعتبار سے بہت فرق ہے اور تہذیبی اور علاقائی رشتے سیاسی اعتبار سے بڑے اہم ہوتے ہیں، تو شاید مختلف تہذیبی اور علاقائی خصوصیات کی زیادہ قدر ہوتی اور مغربی پاکستان کی تہذیب کو جنوبی ایشیائی تہذیب سے برتر نہ سمجھا جاتا۔ مغربی پاکستان نے برابر بنگالی تہذیب، بنگالی مزاج اور بنگالی ذہن کو نظر انداز کیا، بلکہ اسے غیر اسلامی تصور کیا۔ جب انڈونیشیا اور ملیشیا کے مسلمان اس جنوبی ایشیا کی تہذیب کے علمبردار ہونے کے باوجود وسط ایشیا یا مغربی ایشیا کے مسلمانوں سے کم درجے پر مسلمان نہیں ہیں تو بنگال کے مسلمان کس طرح غیر اسلامی اثرات کے نمائندے سمجھے جا سکتے ہیں۔ بنگال کے مسلمان اتنے ہی اچھے مسلمان ہیں جتنے مغربی پاکستان یا کسی دوسرے خطے کے مسلمان، فرق صرف یہ ہے کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے بنگالی ہیں اور اپنی سرزمین، اپنی تہذیب، اپنے ادب اور اپنی زبان پر نہ صرف فخر کرتے ہیں بلکہ اسے اپنی زندگی سمجھتے ہیں۔ وہ جب تقسیم پر آمادہ ہوئے تھے تو اپنی سادگی میں یہ سمجھتے تھے کہ ان کی پسماندہ اکثریت کو مغربی بنگال کے صنعت کاروں سے نجات مل جائے گی مگر تقسیم کے بعد بہت جلد انھیں نظر آگیا کہ ان کی زبان اور ان کی تہذیب کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ جب محمد علی جناح نے یہ اعلان کیا کہ پاکستان کی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی تو انھوں نے پاکستان کی اکثریت کی زبان کو نظر انداز کیا اور بنگلہ دیش کے باسیوں کو نظر آگیا کہ انھیں اپنے علاقے میں اپنی شخصیت کے پورے قد تک پہنچنے کا موقع نہ ملے گا بلکہ انھیں مغربی پاکستان کی فوجی طاقت کی مرضی کے مطابق چلنا پڑے گا۔ ہندوستان کا نشاۃ الثانیہ بنگال ہی سے شروع ہوا۔ بنگالی ادب کا سرمایہ اتنا شاندار ہے کہ اس کا ساری دنیا کو اعتراف ہے۔ بنگال پاکستان کی آمدنی کا بڑا حصہ فراہم کرتا تھا مگر بنگال پر خرچ بہت کم ہوتا تھا۔ بنگال کی صنعتیں مغربی پاکستان کے چند مالدار گھرانوں کے ہاتھ میں تھیں۔ بنگال میں جمہوریت، روشن دماغی، حریت فکر کی روایات گہری تھیں، مگر ان روایات کا پاکستان کے حکمرانوں کو احساس نہیں تھا۔ مغربی پاکستان میں جمہوریت کا تصور دھندلا تھا۔ مغربی پاکستان ایک تہذیبی وحدت کہا جا سکتا ہے، مگر بنگلہ دیش میں مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود تہذیب اور معاشرت کا روپ دوسرا تھا۔

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا